صبحِ سمرقند

از
جناب جیلانی صاحب بی۔ اے

(۲)

انور پاشا کی موت کے بعد سب نگاہیں کسی ایسے شخص کی تلاش میں اٹھنے لگیں جو مسلمانوں کی رہنمائی صحیح طور پر کر سکے۔ بالآخر امیر عالم خاں نے سلیم پاشا کو یہ عہدہ پیش کیا۔ لیکن وہ شخص نہایت حساس طبع اور دردِ دل رکھنے والا تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اب پانی سر کے اوپر سے گزر چکا تھا۔ دریائے Pianj کے کنارے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے اس نے ایک زبردست تقریر کی:

"اے میرے بہادر اور نیک بھائیو! انور پاشا اور میں خدا اور رسول کے کام کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ تم جانتے ہو تم سے غلبہ و حکومت کیوں چھینی گئی؟ تم کو معلوم ہے تم پہلے فاتح کیوں تھے اور اب مفتوح کیوں ہو؟ اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ تمہارے جسموں کے اندر بد روحیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایسے انسان پیدا ہو گئے ہیں جو کسی قانون کی اطاعت نہیں کرتے۔ جو خدا کے مقدس قانون کی بنیاد ہی کو نگاہِ شک سے دیکھتے ہیں۔ خدا ہم سے ناراض ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے تم سے تمہارا وقار و تسلط چھین لیا ہے اور تم پر مصائب کر دیے ہیں۔ ہم غالب تھے جب ہم راہِ اسلام پہ گامزن تھے لیکن ہم مغلوب ہیں جب سے ہم نے اپنے قلوب ان لوگوں کی گرفت میں دے دیے ہیں جو ہماری شریعتِ حقہ اور قوانین ہی کا استہزا و مذاق اڑاتے ہیں۔ میں اپنے پیشرو انور پاشا کے پیچھے جا رہا ہوں جو اس وقت خلدِ بریں میں بیٹھا اپنے حسنِ عمل کا اجر پا رہا ہوگا۔ اگر تم بھی میرا ساتھ دینا چاہتے ہو تو اٹھو اور اپنے بچوں کے محبوب جسموں پر اپنے ہاتھوں سے زرہ بکتر لگا دو۔ خدا کے مقدس قوانین کی پیروی کرو اور شریعتِ اسلامیہ کے لیے کٹ مرو۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنا گھوڑا دریا کی پرغضب لہروں میں ڈال دیا۔ ایک بار اس کا سر کف بہ لب لہروں کے

اور پھر انیکن پھر ہمیشہ کے لیے اس کے سیاہ گھوڑے ہوئے پانی میں گم ہو گیا۔

اب میدان قیادت ابراہیم بیگ کے لیے خالی تھا۔ اس نے نئے سرے سے افواج کی تنظیم شروع کر دی اور بڑے وسیع پیمانے پر بالشویکوں کے خلاف پروپیگنڈے کو پھیلا دیا۔ اس نے سختی کے ساتھ اپنی افواج کا محاسبہ کیا اور اس امر کی خوب احتیاط کی کہ کہیں بالشویک مسلمانوں کو بے دل نہ کرنے پائیں۔ اس نے خفیہ پولیس کا ایسا زبردست انتظام کیا کہ خود بالشویک بھی خوف زدہ ہو گئے۔ کسی انتہائی خفیہ مجلس میں بھی وہ ایک دوسرے کی طرف ایسی شک کی نگاہوں سے دیکھتے گویا ان کے درمیان کوئی ابراہیم کا مخبر بیٹھا ہوا ہو۔

اب میدان جنگ تاجکستان کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ گوریلا حملوں اور سرخ فوج کے چھاپوں کی وجہ سے تمام علاقہ تباہ ہو گیا تھا۔ لوگ آبادیاں چھوڑ کر جنگل میں جا بسے تھے۔ فصلیں برباد ہو گئیں اور دور دور تک ایسا ہو کا عالم تھا کہ ایک متنفس بھی نظر نہ آتا تھا۔ سرخ فوجوں نے مسلمانوں سے تین مضبوط قلعے چھین لیے۔ اس کے باوجود مسلمان اسی دم خم سے لڑ رہے تھے۔ خود بالشویکوں کا یہ حال تھا کہ ان کی تمام قوت اور سرمایہ ان جنگوں کی نذر ہو چکا تھا۔ آخر انھوں نے ایک کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد وحید ہر ممکن ذریعہ سے گوریلا گروہوں کا استیصال تھا۔ اس کا صدر ایک مسلمان بالشویک فیض اللہ خواجہ مامور ہوا۔ مثل مشہور ہے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ اس کمیٹی نے ایسے طریقے ایجاد کیے کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان کٹے۔

ان کے پرکار فریب کا پہلا ہدف علما ہی بنے۔ بالشویکوں نے نہایت معصوم انداز میں ظاہر کیا کہ وہ تو مذہب کے محافظ ہیں اور ان کا مقصد صرف ملک کی عمومی و معاشی حالت کو درست کرنا ہے۔ انھیں بھلا مذہب سے کیا عداوت! علما رام ہوئے اور انھوں نے بالشوزم کے مخالف مسلمانوں کی مذمت کی اور بالشوزم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔

"حکومت نے تہیہ کر لیا کہ کسی صورت میں گوریلا گروہوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے علما کو یقین دلایا کہ ان کی دوست حکومت ہے اور [illegible] وہ مذہبی [illegible] میں بالکل آزاد ہیں۔ مساجد بالکل مامون تھیں۔ ان [illegible] علما پر کوئی تنقید کی [illegible] حکومت نے [illegible] ایسا بنایا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مذہب سے بالکل بے تعلق ہے۔ بالشویکوں کا یہ طرز [illegible]

ایسا کہ اگر ثابت ہوا کہ مسلمان بزرگ اور علما بالشویزم کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے اور گویا گروہوں کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔" (ص ۱۴۳)

علما کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے حکومت کو بڑے صبر و تحمل سے کام لینا پڑا۔ انھوں نے ایسی نرمی اور رواداری سے جڑیں کھوکھلی کرنی شروع کیں کہ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی بچ گئی۔

"مساجد پر بغیر کسی براہ راست حملے کے انھوں نے عوام کے سامنے بانی علما کی حرص و آز اور خود غرضی کی قلعی کھولنی شروع کی۔"

کمیونسٹوں نے اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے جہاں طبقے موجود نہیں تھے وہاں بھی پیدا کر دیے۔ انھوں نے سب سے پہلے ہتھیار خود علما کے اندر سے مہیا کیا۔ انھوں نے غریب علما کو امیر علما کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ علمائے سوء اسلام کے نمائندے بن کر بالشویکوں کے ساتھ مل گئے اور ان کے حق میں بیانات دینے شروع کر دیے۔ انھوں نے قرآن اور حدیث سے حوالے دے دے کر بالشویزم کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک مشہور عالم فخرالدین خدیو ایک بیان میں کہتا ہے:

"میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت نے ہمارے ملک میں امن و آشتی قائم کر کے، اپنے آپ کو مفلسوں اور فاقہ زدوں کا دست گیر اور کفیل ثابت کر دیا ہے۔ حکومت نے یہ چیز لازم سمجھی ہے کہ غریب طبقہ میں تمام زمین کو بانٹ دیا جائے۔ حکومت کے اس مبارک فعل پر میں اسے دعا دیتا ہوں۔ یہ فعل عین نبی کی سنت ہے جو بیویوں کا محض اس لیے قرض دار ہو گیا تھا کہ مفلسوں اور فاقہ کشوں کا پیٹ پالا کرتا تھا۔ اور رسولؐ کے چار خلفا نے واقعی اپنے آپ کو غلاموں کی حیثیت سے بیچ دیا تھا تاکہ غریبوں کا قرضہ ادا کریں۔" ص ۱۸۰

ایک نہیں، اس طرح کے بیسیوں بیانات اشتراکی پریس میں سے نکل رہے تھے۔ ایک عالم نے تو اشتراکیت کی خوبیاں دیکھ کر اپنے مسلمان ہونے پر صاد حذف کیا۔ اس نے کہا: "علما اور جاگیرداروں کے دھوکے میں پھنس کر میں کئی سال تک نازی آباد کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہو کر غریب لوگوں کے دماغوں میں طرح طرح کی خرافات ٹھونستا رہا۔ اب مجھ پر یہ آشکارا ہوا ہے۔ امیر علما کے بیانات پڑھ کر اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں اور

مجھے معلوم ہو گیا کہ قرآن اور حدیث تو ان لوگوں کا معاشی آلۂ کار تھا۔ میں تمام لوگوں اور سوویٹ حکومت کے سامنے حلفیہ
بیان دیتا ہوں کہ اب میں اس اسلام کا خادم نہیں رہا جس پر نہ تو اب میرا ایمان ہے نہ یقین۔ وہ تو محض انسانوں
کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔" ۱۸۰ ص

ایک اور دستاویز بھی دیکھ لیجیے۔ یہ ایک دیہات کے عوام کی طرف سے ہے:

"ہم اور ہمارے اجداد مدتوں سے طفیلی امرا اور علما کا جوا اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے تھے۔ علمائے
مذہبی خدع و فریب سے ہمارے اندر عداوت کا بیج بوتے رہے اور ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ برسرپیکار رہے۔
علما ہماری نااتفاقی سے ہمیشہ فرحاں رہے۔ اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علما قرآن اور حدیث سے اقتباسات
کھریچ کھریچ کر نکال رہے ہیں اور تمام ازبکستان میں ایک اودھم سا مچا رکھا ہے۔ ہم تمام اہل دہ ان کے
فتاویٰ کا دنداں شکن جواب دیں گے۔ اے علما اس شور و غوغا مچانے سے پہلے تم کہاں تھے؟ اور تم جو ہمارے
روحانی پیشوا بننے کا دعویٰ رکھتے تھے ہمیں تمام عمر بیوقوف بناتے رہے تاکہ ہماری آنکھیں کبھی نہ کھلنے پائیں۔
ہم تمام اہل دہ تمھارے جعل و فریب کو دیکھ رہے ہیں۔ اب ہم تمھارے دھوکے میں آنے کے نہیں۔ ہم
صرف مزدوروں کی حکومت پر اعتماد رکھتے ہیں۔"

اب اس صورت میں جبکہ کعبہ کے محافظ خود ہی تخریب کعبہ پر آمادہ ہوں تو ابرہہ کو لشکرکشی کی کیا پڑی!

اسی کتاب میں آگے چل کر ذکر آتا ہے:

"جب علما نے مسلمانوں کو زرعی تقسیم کی مخالفت کے لیے ابھارا تو علمائے تابعین (Periferts) یہ لفظ
خود مصنف نے استعمال کیا ہے اور ان معنوں میں کہ اب بالشوزم کی حقانیت ان پر روشن ہو چکی تھی) نے
جن کی پشت پر حکومت کی مدد تھی، اس کے حق میں فتوے جاری کر دیے۔ پس بجائے اس کے کہ بالشویکی لوگ
کی مخالفت کرتے یا قرآن کے خلاف جنگ لڑتے اور اس طرح عوام کی دشمنی مول لیتے۔ انھوں نے اس
موقع کو غنیمت جان کر اس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور علما کے خلاف علما ہی کے فتووں کو بطور
ہتھیار کے استعمال کیا۔" ۱۷۹ ص

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی ہفتوں کے اندر اندر مذہبی محاذ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ حتیٰ کہ متشدد قسم کے

مجنون باغی علما بھی اس بات پر مجبور ہو گئے کہ غیر جانب دار ہیں"۔ (۱۸۱ ص) مصنف کتاب اس پر تبصرہ کرتا ہے

"اس سے زیادہ اور کیا ہوتا۔ اسلام کی تاریخ میں پہلی بار احکام الٰہی کو ترک کر کے الحاد و بالشوزم قبول کر لیا گیا۔" ۱۸۱ ص

دشمن کے منہ سے نکلی ہوئی ایک بات بعض اوقات حقیقت کو روشن کر دیتی ہے۔ غریب علما کی حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"بالشویکوں کا کوئی زبردست سے زبردست خلاف مذہب پروپیگنڈا بھی اتنا غارت گر ثابت نہ ہوتا جتنا کہ خود ان خادمان دین کی حماقت و خود غرضی کا بے وقار رویہ تباہ کن ثابت ہوا۔"

دوسری طرف کمیونسٹوں نے جاہل اور دیہاتی طبقہ میں اپنا اثر و نفوذ شروع کر دیا کیونکہ دیہاتوں کو ہاتھ میں لیے بغیر اشتراکیت آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔ بقول مصنف "ایک منضبط لائحۂ کار رسم پہنچانے کے لیے حکومت کے لیے لازم ہے کہ وہ دیہات میں انجمنیں قائم کرے جن کی سرپرستی براہ راست اپنے ذمہ لے اور ان میں ایسی چنگاری پیدا کر دے [illegible] جو دیہاتی آبادی کو مختلف طبقوں میں پھاڑ دے۔" ۱۸۰ ص

گاؤں میں انھوں نے یہی کام شروع کیا۔ طبقہ وار انتزاع و تشتت کے بغیر اشتراکیت کا کام چل نہیں سکتا۔ یہ جو تمام عالم کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں ان کے اجتماع کی بنیاد تفرقہ پر قائم ہے۔ جہاں طبقے قائم نہ ہوں گے اپنی ریشہ دوانیوں سے وہاں طبقے قائم کریں گے تاکہ تمام دنیا پر ان کا صادق القول ہونا ثابت ہو جائے۔

"طبقاتی کشمکش کو ہوا دینا اور سب سے دھڑلے انقلابی سرگرمیاں دیہاتی انجمنوں سے مخالفوں اور دشمنوں کو خود بخود ختم کر دیں گی۔" ۱۸۰ ص

ان انجمنوں کا مقصد جیسا کہ معلوم ہو گیا ہے گوریلا گروہوں میں شامل ہونے والے مسلمانوں اور علما اور ان کے پردے میں اسلام کے خلاف عوام میں ایک نفرت اور بیزاری برپا کرنا تھا۔

"۱۹۲۳ تک متوسط طبقہ اور نچلے طبقے کی کئی انجمنیں قائم ہو گئیں۔ ان میں سے ایک Peasants Union کسانوں کی انجمن تھی جو کسانوں کے اندر علما اور ان کے سابقہ ائمہ کے خلاف ایک نفرت کو

اور تشتشو کرنے کا کام بڑی تندہی سے کر رہی تھی" ۱۴۴ ص

تیسری اصلاح جو حکومت بخارا نے کی وہ نئی طرز کی تعلیم کا پھیلانا تھا۔

"حکومت دینی مدرسوں کی تعلیم سے خائف تھی۔ نئی تعلیم پھیلانے کے لیے حکومت نے ہر طرح کے انعام اور مراعات جاری کر دیں۔ جو والدین اپنے بچے کو سوویٹ اسکول میں بھیجنے پر راضی ہوتے حکومت ان کی مالی مدد کرتی" ۱۴۳ ص

جدید تمدن کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا ہے۔ خواص اور ذہنی رہنماؤں کی ایک مجلس بیٹھتی ہے جس میں ثقافتی انقلاب کے ذرائع پر غور و خوض کیا جاتا ہے۔

"اس کے فوراً بعد ہی کوکند میں سیکڑوں ترقی پسند لیڈروں کی مجلس بلائی گئی تاکہ ازبکستان کی معاشی اور ثقافتی زندگی کے ہر پہلو پر بحث و تمحیص کی جائے" ۱۸۲ ص

طرح طرح کی اقتصادی اسکیمیں بالشویکی سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نکل رہی تھیں۔ پختہ سڑکوں کا جال بچھ رہا تھا۔ روس کے قابل ڈاکٹر اور حسین نرسیں درآمد کی جا رہی تھیں۔ کارخانے اس سرعت سے کھولے گئے کہ چند ہی سالوں میں بخارا وسطی ایشیا کا جدید مرکز بن گیا۔ کارخانے کھولنے کا مقصد یہ تھا کہ مفلس طبقہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں سوویٹ نظام کی طرف کھنچا چلا آئے۔

"روسی بالشویکوں کے نزدیک پہلا مرحلہ صنعتی اداروں کا اجرا تھا تاکہ نچلا طبقہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کی طرف راغب ہو" ۱۵۰ ص

اگرچہ ہر تجویز آسمان ماسکو سے نازل ہو رہی تھی بایں ہمہ پکارنے والے پکار رہے تھے۔ یہ عدالتیں کس کی ہیں؟ یہ مدرسے کس کے ہیں؟ یہ فوج اور پولیس کس کی ہے؟ اور جواب دینے والے بیک آواز بول رہے تھے "جمہور کے" (۱۵۰ ص) شریعت کو اس لیے توڑا گیا کہ یہ مذہب کی زنجیریں ہیں جس سے وہ انسانوں کی آزادی کو جکڑتی ہے اور اس کے بجائے جو قانون رائج کیا گیا وہ مارکس اور لینن کی تحریروں سے اخذ تھا۔

"یہ بالکل عیاں تھا کہ بخارا کی سوویٹ دوسری سوویٹ ری پبلکوں کے پرولتاریہ کی مدد سے اور مارکس اور لینن کے نظریات کی رہنمائی میں اشتراکی جادہ پر گامزن تھی"

لیکن طرفہ تماشا یہ کہ قانون پاس کرنے والے سمجھ رہے تھے کہ یہ تو سب کچھ انھیں کے ہاتھوں بنائے ہوئے تھے۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۲۴ء کو کل بخارا کانگریس میں یہ فیصلہ ہوتا ہے:

"مزدور طبقہ کی رائے عامہ سوویٹ حکومت کا قانون ہوتا ہے"۔ ۱۰۵ ص

ترقی کی یہ شاہراہیں، بالشویکوں کا نظم ونسق اور گوریلا گروہوں کی داخلی بدنظمی رنگ لائے بغیر کس طرح رہ سکتی تھی۔ ابراہیم بک کی قوت روبہ تنزل تھی۔ مسلمان طاقتوں سے بددل ہو رہے تھے۔ جب کہ ایک طرف لکڑی کے صدیوں پرانے ہل چل رہے تھے تو دوسری طرف جدید ترین ٹریکٹر زمین کا سینہ تہ وبالا کر رہے تھے۔ ایک طرف یہ منظر کہ کہیں کہیں سرکیں ہر جگہ بل کھاتی ہوئی جا رہی تھیں جن پر امریکہ اور جرمنی کی موٹروں کے نئے نمونے فرفر رواں تھے۔ لیکن اس طرف یہ حال تھا کہ "بعض پہاڑی علاقوں میں پہیے کا اصول تک نامعلوم تھا۔ کسان زمین کی سطح کو ایک لکڑی سے کریدتے تھے جس کو ایک بیل کھینچتا تھا۔ دیہاتوں میں لوگوں نے مٹی کے تیل کا نام تک نہ سنا تھا۔ وہ روئی کی بتی سی بنا کر اسے مچھلی کے تیل میں ڈبو کر جلاتے تھے۔" (۱۹۵ ص)۔ پھر ایسی مادی دنیا میں مادی وسائل کے بغیر کب جیت ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۲۵ء تک یہ تحریک پورے گرہن میں آگئی۔ اگرچہ گوریلا گروہوں کی شورش ۱۹۳۱ء تک باقی رہی لیکن وہ قوت اور زور باقی نہ رہا تھا۔ سرخ فوجوں کا دباؤ ابراہیم بک کو دھکیلتا ہوا افغانستان کی سرحدوں تک لے گیا۔ جہاں اسے کچھ وقت کے لیے امان اللہ خاں سے پناہ مل گئی لیکن افغانستان کی خانہ جنگی نے انھیں پھر نکال باہر کیا۔ اب وہ دریا اور گھاٹی کے درمیان گھر گئے تھے۔ جائے پناہ کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ اور سامنے سے سرخ فوجیں عقاب کی مانند اڑی چلی آ رہی تھیں۔ ابراہیم اپنی ناتوانی کے باوجود بالشویکوں کے لیے ایک ہوا بنا ہوا تھا لیکن جب ترکستان کے مسلمان بھی گوریلا گروہوں کی مخالفت میں حصہ لینے لگے تو اس کا رہا سہا اقتدار بھی زائل ہو گیا۔ ۱۹۳۵ء میں ابراہیم بک کو گرفتار کر لیا گیا اور سرگرمی ہمیشہ کے لیے سرد ہو گئی۔ ایمان کی آخری کرنیں مٹھی مٹھی چند دلوں میں باقی رہ گئیں تھیں۔ وہ اپنے ایمان کے چیتھڑوں کو سینوں سے چمٹائے افغانستان اور ہندوستان کی طرف ہجرت کر آئے جو باقی رہ گئے وہ روسی گرگسوں کا شکار بن گئے۔

۱۹۲۶ء تک زرعی تقسیم بہت حد تک ہو چکی تھی۔ اور علماء کا اثر و رسوخ بھی قریب زائل ہو چکا

تھا۔ اب اشتراکیوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ میدان بالکل صاف تھا اس لیے انھوں نے اشتراکیت کے مکمل نفوذ کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ مجموعی زراعت (Collective farming) کی اسکیم نافذ کر دی گئی۔ یہ طرز زراعت بالکل انوکھا اور اجنبی تھا اس لیے کسانوں کا بدکنا ایک لازمی امر تھا۔ انھوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ان میں مختلف قسم کی افواہیں پھیل گئیں جن سے خائف ہو کر انھوں نے اس اسکیم کی اعانت کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن طاقت کے نشہ سے چور اشتراکی یہ انکار کب گوارا کر سکتے تھے۔ انھوں نے وہ ظلم ڈھانے شروع کیے کہ کسان لرز اٹھے۔ کتاب کا مصنف لکھتا ہے کہ ایک کسان نے مجموعی زراعت کی تنظیم کے زمانے کا ایک واقعہ اسے سنایا۔ "ایک غریب کسان نے مجھے سنایا کہ کس طرح عبداللہ نامی ایک مقامی کمیونسٹ نے مجموعی زراعت کی تنظیم کی۔ ایک اجتماع میں جس کو عبداللہ نے خطاب کیا [illegible] کسان موجود تھے۔ جب عبداللہ نے ان کو مجموعی زراعت میں شامل ہونے کے لیے کہا تو خاموشی [illegible] پیش کیا۔ یہ دیکھ کر عبداللہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اپنا مکا دکھاتے ہوئے گالیاں اور دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ اس نے اعلان کر دیا کہ جو کسان مجموعی زراعت میں شامل نہ ہوگا اسے زمین ملے گی نہ قرضہ۔ یہ سن کر وہ غریب کسان بولے تو ہم شامل ہونے کو تیار ہیں۔ لیکن عبداللہ کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے انھیں بدتمیزی سے مایوس کر دیا۔ "اب کوئی ضرورت نہیں۔ اب تم اپنی ناک بھی رگڑو گے تو بھی ہم تمھارے اخلاص کے قائل نہ ہوں گے۔ اور وہ لوگ جو شامل ہونے کے بعد چھوڑ جائیں گے ان کی زمین گھوڑے گاڑیاں سب ضبط ہو جائے گی" — عبداللہ کی رپورٹ پر ان کسانوں کو زمین نہ ملی اور انھیں "دشمن مجموعیت" کا خطاب دے کر ذلیل کیا گیا۔ ۱۹۰ ص

ان کی ترغیب کے طریقے اس سے زیادہ انوکھے تھے۔ بعض پرجوش زرعی منتظموں نے اعلان کر دیا کہ جو شخص مجموعی زراعت میں شامل ہوگا ہم اسے ایک بیوی عطا کریں گے۔ اور بعض منتظم تو جنون کی آخری حد بھی پھلانگ گئے۔ ایک کمیونسٹ شراب پی کر بدمست ہو جاتا اور کسانوں کے سامنے کھڑا ہو کر تقریر کرتا "اللہ کی مدد سے ہم نے تم سے مویشی تو ہتھیا لیے ہیں۔ اب تیار ہو جاؤ ہم تمھاری بیویوں اور بیٹیوں کو بھی مجموعہ بنانے والے ہیں۔ ہم انھیں اپنے ساتھ سلائیں گے۔ اس صورت میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ

اچھی طرح گھل مل جائیں گے"۔ ۱۹۲ص

اگر لکھنے والا کوئی غیر اشتراکی ہوتا تو ہمیں باور کرنے میں شاید تامل ہوتا۔ مصنف نہ صرف کمیونسٹ ہے بلکہ بالشویک بھی ہے۔ وہ واقعات کو خود اس طرح پرکھ پرکھ کر درج کر رہا ہے کہ اس کی تحریر اور بھی زیادہ مستند اور وقیع ہو جاتی ہے۔ یہ یاد رہے یہ ان لوگوں کے کارنامے ہیں جنھوں نے آغاز عہد میں ان مسلمانوں کو اپنی پناہ پیش کی تھی جن کی مساجد زار روس کی دست ظلم کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ اور جن کے اسلام کی حرمت و عظمت ان کرمہشیوں کے پاؤں تلے تاڑی گئی۔ ذرا ملاحظہ کیجیے سزاؤں کی انتہا کہاں تک پہنچی ہے۔

"کوکند کے ایک دیہات میں دس کسان مجموعی زراعت کی رکنیت سے اس وجہ سے برطرف کیے گئے کہ وہ مسجد میں نماز ادا کرتے دیکھے گئے تھے۔ Kodja Yakshabo گاؤں کی مجموعی زراعت محض اس لیے توڑ دی گئی کہ اس کے ارکان مسجد میں جانے پر مصر ہوتے تھے۔ بخارا کے اضلاع میں بعض سرگرم افسروں نے لاش کا جلانا ضروری قرار دے دیا۔ اور ضلع کاشکا دریا میں ایک عالم کمیونسٹ نے بعض کسانوں کو مجموعی زراعت سے اس لیے نکال دیا کہ وہ ان سوالوں کا جواب نہ دے سکے: "اشتراکیت کیا ہے؟ ڈارون کا عہد زندگی کونسا تھا؟" ــــ ایک گاؤں مازہ میں ایک کمیونسٹ نے ان کسانوں کے پیچھے فوج لگا دی جنھوں نے مجموعی زراعت میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ فوج انھیں پورے بیس میل تک بھگاتی لے گئی۔" ۱۹۲ص

اسلام اور اشتراکیت کی ٹکر ایک انتظامی صورت تدبیر اور مذہب کی ٹکر نہ تھی بلکہ دو ادیان کی ٹکر تھی جو پوری کی پوری انسانی زندگی کو اپنے احاطہ میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ علماء اپنی نالائقی اور نااہلی کے لیے کتنے مطعون قرار کیوں نہ دیے جائیں لیکن یہ انھی کی قوت شامہ ہے جو ہر غیر اسلامی رو کو دور ہی سے سونگھ لیتی ہے۔ خود ہندستان میں جب پہلے پہل مغربی تہذیب کے مسموم بخارات ابھرے تو یہ علماء ہی تھے جنھوں نے سب سے اول اس خطرہ کا احساس کیا۔ اور ترکستان میں بھی یہی لوگ تھے جنھوں نے اشتراکیت کی ہلاکت سامانیوں کا سب سے پہلے اندازہ کیا۔ یہ خیال رہے کہ ان علما کی مخالفت کا زاویہ لوگوں کی مخالفت کے نقطہ نظر سے بالکل جدا اور الگ تھا۔ لوگوں کی مخالفت تو محض حکومت کے زیر و زبر ہو جانے کے ڈر سے تھی لیکن ان کی عداوت ایک

طرزِ زندگی کے منقلب ہو جانے کے خوف کا نتیجہ تھی۔ اور اشتراکیت کو اگر کسی نے صحیح طور پر سمجھا تھا تو علماء ہی تھے۔ بالشویک اپنی زندگی کی یوں تعبیر کرتے ہیں۔ ایک شخص ایک مشہور بالشویک افسر سے باتوں باتوں میں پوچھتا ہے:

"آپ کی طرزِ گفتگو سے میں نے سمجھا آپ تاجک ہیں۔"

"تاجک نہیں، بالشویک" سلوچک (بالشویک افسر کا نام) نے تصحیح کرتے ہوئے جواب دیا۔ ۲۰۸ ص

ایک بالشویک کی صحیح شخصیت کیا ہے؟ اس کی تشریح سن لیجیے:

"سلوچک نہ تو یہودی ہونے کی حیثیت سے گفتگو کر رہا تھا اور نہ روسی ہونے کی حیثیت سے۔ اسے اپنے تاجک ہونے پر بھی ناز نہ تھا۔ وہ ایک بالشویک کی حیثیت سے بول رہا تھا ——— ایک بالشویک کی حیثیت سے جو سوویٹ یونین کے ہر محاذ کی فتح کو بالشوزم کی فتح تصور کرتا تھا۔" ۲۰۸ ص

ایک دین کی حیثیت سے وہ لوگ اول آخر بالشویک تھے۔ اور اسی نظام اور فلسفے کے تقاضے تھے جن کے ایفا کے لیے وہ انسانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر چھا رہے تھے۔ نمازیں انھیں اسی لیے گوارا نہ تھیں کہ ان کے فلسفۂ حیات کی رو سے وہ بغاوت تھی۔ ۱۹۲۲ کی روسی کمیونسٹ پارٹی کی روداد میں طریقہ کار کے بیان میں یہ الفاظ آتے ہیں۔

"اسی رو سے ہماری جماعت کا دوسرا اہم اور سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ہم قوموں کے درمیان پیدا شدہ غیر مساوی درجات کو اڑا دینے اور پسماندہ قوموں کا ثقافتی (Cultural) اور معاشی معیار بلند کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کریں۔"

ثقافت کا تعلق سر تا سر انسانی دل سے ہے۔ یہ تہذیب و تمدن دراصل انسان کی مادی زندگی کے نفسیاتی پہلو ہیں اس لیے بالشویکوں نے جب ثقافتی انقلاب کا بیڑا اٹھایا تو دوسری ثقافتوں اور تمدن کا ڈھے جانا ایک قدرتی امر تھا۔ پھر جب ایک بار خاطر خواہ ثقافت پھیل گئی تو ان کے معاشی نظریات کے لیے وہ یقیناً ایک مستقل حفاظتی قلعہ ہے اپنی منزل کار کی طرف بڑھنے میں بالشویکوں نے بڑی احتیاط اور ہنرمندی سے کام لینا شروع کیا۔

انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے قومی وجود، ان کی پرانی ثقافت اور ان کی زبان اور رسم و رواج کو تسلیم کر لیا اور یہ ظاہر کیا کہ ان کا مطلب ان سے کسی قسم کا تعارض پیدا کرنا نہیں۔ لیکن در پردہ یہ دروازہ تھا جس سے اندر گھسنے اور اثر و رسوخ پیدا کرنے کا۔ بخارا سوویٹ کا وائس پریزیڈنٹ یوں اس فعل کی تعبیر کرتا ہے۔

"ہمیں مقامی عوام، کسانوں اور مزدوروں کے اندر گھسنا تھا۔ اس کے لیے واحد طریقہ یہ تھا کہ ہم ان کے پاس انہی کی زبان اور انہی کی ثقافت جس سے کہ وہ محبت رکھتے تھے لیے ہوئے جاتے۔" ۲۱۴ ص

بعض اوقات وہ مسلمانوں کے ساتھ مسجدوں میں جاتے اور ان کے ساتھ نمازوں میں شریک ہوتے۔ ان کے ہر کام میں ایک گونہ دلچسپی کا اظہار کرتے، اور ان کی ہر مشکل میں ہاتھ بٹاتے اور اسی طرح آہستہ آہستہ ان کے ایمان کی جڑوں کو کھوکھلا کیے جاتے۔ جب ایک اشتراکی سیاح نے بخارا کے وائس پریذیڈنٹ کے سامنے اس بات پر تعجب ظاہر کیا کہ کیوں بعض کمیونسٹ ابھی تک اسلامی مراسم بجا لاتے ہیں تو اس نے جواب دیا:

"یہ امر ہمارے لیے کسی تشویش کا باعث نہیں۔ سب سے پہلی چیز جو ہم ایک شخص میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کیا بورژوا سے زمین چھیننے میں وہ ہمارے ساتھ ہے؟ کیا وہ مجموعی زراعت اور صنعت میں ہمارے نقطۂ خیال کا مؤید ہے؟ اور کیا ہمارے لائحۂ عمل کے مطابق کام کرے گا؟ اگر وہ ایسا کرے گا تو ہم اسے اپنی جماعت میں شامل کر لیں گے۔ آپ کو یہ بات ضرور پیش نظر رکھنی چاہیے کہ عوام کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے ہمیں اپنے اندر کچھ نہ کچھ لچک اور گنجائش ضرور رکھنی چاہیے۔ ہم پر ایک عظیم الشان سوسائٹی کا بوجھ ڈالا گیا ہے۔ ہم محض کو نفاذ، قلم اور تخیل سے نہیں کھیل سکتے۔ یہاں مارکس اور لینن کے خیالات کی قبولیت شرط رکنیت نہیں۔ جو شخص ہم سے متاثر ہو کر ہمارے قریب آتا ہے تو چند ماہ کے میل جول کے بعد وہ بغیر کسی کد و کاوش کے ہمارے کل خیالات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ جب ایک شخص ہمارے قریب آتا ہے تو وہ ہماری تعلیم و تہذیب کے بھی قریب آئے گا۔ ہم اس وقت انقلابی دور میں سے گزر رہے ہیں اس لیے ایسے عجیب اطوار ارکان کا داخل ہو جانا کوئی بعید امر نہیں۔" ۲۱۲ ص

تبلیغ کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کے لیے کمیونسٹوں نے ہر ممکن ذرائع اختیار کیے۔ انھوں نے جابجا سینما ہال کھول دیے جن میں ایسی فلمیں دکھائی جاتیں جن کی کہانیوں کے پس پردہ اشتراکی تعلیم اپنا کام کر رہی تھی۔ قہوہ خانوں، ہوٹلوں، میلوں اور ہر جگہ کے سامنے کھڑے ہو کر تقریریں شروع کر دیتے۔ مسجدوں کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو ہو کر وہ اپنے دین کی تبلیغ کرتے۔

"ملک کو مجوزہ اصلاحات کی بابت تشریحی رسالوں، کتابوں، اور اشتہاروں سے بھر دیا۔ اس سے زیادہ مؤثر زبان کے الفاظ تھے۔ انھوں نے سینکڑوں ٹرینڈ مقرر ہر ہر گاؤں میں بھیج دیے۔ یونیورسٹیوں کے طلبہ بھی بڑے شوق سے اس کام میں شریک ہو گئے۔ بیسیوں لاریاں ملک میں چھوڑ دیں جن کے اوپر ہر طرف بڑے بڑے پوسٹر اور نعرے مرقوم تھے۔

جو میلے، ہجوم، جائے خانے اور سب کے سامنے کھڑی ہو جاتیں اور ایک اسٹیج بچھا دیتیں جس پر گویے، اداکار اور باجہ بجانے والے راگ رنگ دکھانا شروع کر دیتے۔ پھر وہ لوگوں کے سامنے مجوزہ اصلاح کی تشریح کرتے، ان کے شکوک کو رفع کرتے اور ان کو اس کام میں معاونت پر اکساتے۔ تفریحی پارٹیاں ۱۹۲۵ء میں چکر لگاتیں اور ایک ناٹک دکھاتیں جس کا نام تھا "مسلمان نواب کا مقدمہ"۔"

اشتراکی ثقافت اپنے لیے ایک قالب کی تلاش کر رہی تھی سو اسے وہ بھی مل گیا۔ ۱۹۲۶ء میں دوشانبے کے قریب ایک شہر استالن آباد تعمیر کیا گیا جو اپنے طرز عمارت میں جدید ترین قسم کا تھا۔ اس کی خوبصورت پختہ سڑکوں، سینماؤں، ناچ گھروں اور تفریحی پارکوں کے علاوہ سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ شہر عبادت گاہوں سے پاک تھا۔

"اور استالن آباد کی ایک خصوصیت جو ایک تاجک کمیونسٹ بیان کرنے سے کبھی نہ چوکتا ——— وہ یہ ہے کہ استالن آباد دنیا میں سب سے پہلا شہر تھا جس میں کوئی عبادت خانہ نہ تھا، کوئی مسجد نہ تھی، کوئی گرجا نہ تھا، کوئی صومعہ نہ تھا۔ اور طرفہ یہ کہ یہ سب کچھ ایشیا کی تاریک گہرائیوں میں ہو رہا ہو۔" ۲۲۲ ص

تاجکستان پر ایک عرصہ قبل اسلام کے فدائی پروانوں سے رونق افروز تھا اب نئی تعلیم کے ہنگاموں میں ڈوب چکا تھا۔ قرآن خوانی کی آواز پیانو کے سروں میں دب چکی تھی۔ اسلامی طرز تعلیم کو یک قلم اڑا دیا گیا اور اس کی بجائے نیا نصاب تعلیم رائج ہو گیا۔

"اور وہ چند ایک مدرسے جن میں قرآنی تعلیم کے سوا اور کوئی تعلیم نہ دی جاتی تھی اب سراب بنتے چلے جا رہے تھے، اور وہ پرانی قسم کے علماء، مدرس اور مذہبی طلبا بھی غائب ہو گئے۔" ۲۲۰ ص

علماء کی بجائے مدرسوں میں اشتراکی مدرس نظر آ رہے تھے۔ امید کی آخری کرنیں بھی غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ مسلمان ماؤں کی گودوں میں پلنے والے بچے اب اسلام کش بنائے جا رہے تھے۔ اسی خطرہ کا احساس تھا کہ گوریلا گروہ جب کسی مقام پر حملہ آور ہوتے تو اسکول کے مدرسوں کو سب سے پہلے تہ تیغ کرتے۔

"اور یہ ایک خاص بات ہے کہ گوریلا گروہ جب کسی گاؤں میں پہنچتے تو گاؤں کے مدرس سب سے پہلے ہدف تیغ بنتے۔ معلم دراصل نئے علوم، مسلمان عورت کی آزادی، مجموعی زراعت اور ہر اس چیز کا جو قدماء کے لیے وجہ نفرت ہے، علمبردار ہے۔ وسطی ایشیا کا دیہاتی معلم رذیل اور فساد کا بدترین دشمن اور کمیونسٹ مقاصد کا گہرا دوست

اور سوند ہے۔ دیہاتی مسلم بیدار تاجکستان کی نشانی ہے۔" ۲۲۹ ص

مصنف کے قول کے مطابق "تاجکستان دین اسلام اور دین مارکس و لینن کی جنگ کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔" دنیا میں کوئی نظام اس لیے غالب ہوتا ہے کہ اس کے علمبردار غالب ہوتے ہیں۔ دین مارکس کے پیرو غالب و زبردست تھے وہ اپنے دین کے لیے ہر قربانی کے لیے تیار تھے اس لیے مسلمانوں کو اپنے دین کے آخری گوشے سینوں میں چھپانے منہزم ہونا پڑا۔ اشتراکیوں نے مسجدوں پر اپنے پھریرے نصب کرائے، اور خدا کے گھر شیطان کی تعلیم گاہ بن گئے۔

"مسجد مجلس گاہ بن گئی، اور اس پر سرخ جھنڈے نصب کر دیئے گئے۔ یوں قصہ ختم ہوا۔" ۲۴۹ ص

"ہر گاؤں میں ایک 'سرخ چائے خانہ' بن گیا، اور اکثر گاؤں میں ہم نے مسجدوں کو جدید تعلیم کے مکتب بنا ہوا پایا۔" ۲۵۰ ص

اب کیا آپ عورتوں کی اٹھان کی داستان بھی سنیں گے؟ ـــــ وہ جو امت کی مائیں بننے والی تھیں۔

مصنف تاشقند کی وومن ڈیپارٹمنٹ کی ایک سربرآوردہ روسی عورت سے ملاقات کرتا ہے۔ اور اس سے عورتوں میں اصلاحی کام کی داستان سنتا ہے۔ یہ ڈیپارٹمنٹ ۱۹۱۵ میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد عورتوں میں تعلیم تنظیم پھیلانا اور قدیم روایات کے خلاف جذبہ نفرت ابھارنا تھا۔ روسی کمیونسٹ عورتوں نے گاؤں گاؤں تبلیغی دورے کیے۔ اسی دوران میں سب سے بڑی مشکل جو انھیں پیش آئی یہ تھی:

"کہ ایک تو ہم ان کی زبان نہ جانتی تھیں اور دوسری بڑی مشکل یہ تھی کہ ہماری جماعت میں کوئی مسلمان عورت نہ تھی۔" ۲۷۵ ص

بڑی تلاش و جد و جہد کے بعد ایک تاتار عورت میسر آئی جس نے انھیں مسلمان گھرانوں کے تمام رسم و رواج سے آگاہ کیا۔ انھوں نے اسی عورت کے ذریعے مسلمان گھروں میں راہ و رسم بڑھانی شروع کی جب وہ کافی حد تک شناسائی پیدا کر چکیں تو انھوں نے سب سے پہلے عورتوں کے ذہین طبقہ پر چھاپہ مارنے کی ٹھانی۔

"ہم نے سب سے پہلے مسلمان عورتوں کے ذہین طبقہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کی سعی کی۔" ۲۷۶ ص

لیکن جب ذہین طبقہ اس طرف متوجہ نہ ہوا تو انھوں نے مفلس طبقہ کی طرف رخ کیا۔ ان کو اپنی طرف مبذول کرنا یقیناً سہل تھا۔ وہ ان کے پاس جاتیں اور انھیں روئی کاتنے کو دیتیں۔ انھیں اکثر کسی نہ کسی کام پر لگا کر

زیادہ سے زیادہ اجرت دینی شروع کر دی۔ پیسے میں واقعی بڑی کشش ہوتی ہے، پھر جہاں افلاس و جہالت کا جوڑ میل ہو وہاں تو اس کا پورا پورا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ محکمہ اناشا کی لیڈر بیان کرتی ہے:

"پھر جب ہم نے مقامی عورتوں میں زر نقد دے کر نفوذ کرنا شروع کیا تو انھوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔" ۲۷۷ ص

مسلمان عورتیں مذہبی قیود کو توڑنا گوارا نہ کرتی تھیں اس لیے ان میں بہت آہستہ آہستہ اور قدم پھونک پھونک کر کام کرنا پڑا۔ کمیونسٹ عورتوں نے اول امور خانہ داری میں اصلاح و ترمیم کرنے اور مشورے دینے تک ہی اکتفا کیا۔ جب یہ دیکھا کہ وہ عورتیں ان سے مانوس ہو چکی ہیں تو انھیں باہر کی دنیا کے سبز باغ دکھانا شروع کر دیے۔ اور انھیں آمادہ کیا کہ گھر کی تنگ چار دیواری سے باہر نکل کر تو ذرا دیکھیں۔

"ہم نے اب ثقافتی تربیت بھی دینی شروع کر دی۔ مجلسوں کے بعد کھیل تماشے اور گانے ہو جاتے پھر ہم انھیں جدید شہروں کی سیر کرانے لے گئے۔" ۲۷۷ ص

اب قدم اور بڑھا۔ کمیونسٹ عورتوں نے زنانہ کلبوں کی بنیاد ڈال دی۔ اور مسلمان عورتوں کو ترغیب دے کر اپنے ساتھ لائیں۔ ایک کمیونسٹ عورت کا مشاہدہ ہے کہ "اگرچہ کلب گھر میں جانے کے لیے کسی پردہ کے اتارنے کی ضرورت نہیں لیکن وہاں جانے کا لازمی نتیجہ بے پردگی ضرور ہے۔" ۲۸۵ ص

کامیابی کمیونسٹوں کے قدم چومنے لگی۔ عورتیں بڑھ بڑھ کر راگ ودیا اور Concerts میں حصہ لینے لگیں۔ ایک راگ ودیا میں صرف عورتوں نے حصہ لیا اور جب مردوں نے اس منظر کو دیکھا تو حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اب عورتیں مطلوبہ شاہراہ پر خود بخود گامزن تھیں اور سر بازار "برقع جلا دو" کے نعرے لگاتی پھرتی تھیں۔ کمیونسٹ حلقوں میں برقعہ کو "سیاہ ڈھکنے والا کفن" کہا جاتا تھا۔ مسلمان عورتوں کے ایک گروہ کو ماسکو کی سیر کرائی گئی۔ اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے عدالتوں کے دروازے ان پر کھول دیے گئے۔ اور پھر ——

"ترکستان کی وسطی مجلس عاملہ نے محسوس کیا کہ اب ٹھیک وقت ہے کہ ہم تعدد ازدواج، نکاح بالجبر اور شادی بیاہ کی دوسری مکروہات کو ممنوع قرار دیں۔" ۲۷۹ ص

ایک بڑی سرگرم مسلمان عورت خدیجہ نامی (Khozaat) سے مصنف کتاب کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ

اپنے سوانح زندگی سناتے ہوئے بتاتی ہے کہ کس طرح وہ ایک ٹھیٹھ مسلمان گھر میں جنم لیتی ہے جہاں دس برس کی عمر میں اسے پردہ کے اندر بٹھا دیا جاتا ہے۔ پھر اس کی شادی ہوتی ہے لیکن شومئی قسمت اس کا بیاہتا شوہر چھ ماہ کے بعد اسے تنہا چھوڑ کر ملک عدم کی راہ لیتا ہے۔ مصیبت کے دنوں میں اسے ایک صوفی منش شخص کے ہاں پناہ ملتی ہے یہاں وہ رسوئی کا کام کرنے پر مامور ہو جاتی ہے۔ ایک دن وہ گھر سے باہر نکلی تو وہ کیا دیکھتی ہے کہ "عورتوں کا ایک جم غفیر جا رہا ہے جس میں جوان سال اور سن رسیدہ ہر طرح کی عورتیں شریک تھیں۔ وہ کھلے بندوں بے پردہ پھر رہی تھیں۔ ان کے آگے ایک اجنبی قسم کا باجہ بج رہا تھا اور نوجوان لڑکے عجیب و غریب گیت گا رہے تھے۔ گاہ گاہ کوئی چیختا چلاتا ایک پرزور نعرہ لگا دیتا۔ "برقعے اتار دو"، "وسطی ایشیا کی آزاد عورت زندہ باد"، "ملا اور نواب مردہ باد"، "سوویٹ حکومت زندہ باد"۔ لڑکیاں لڑکے اچھل کود رہے تھے۔ اس عجیب نظارے نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ ان کے پیچھے ہو لی۔ ایک کھلے صحن میں پہنچ کر تمام لوگ جا بیٹھے اور ایک عورت تقریر کرنے لگی۔ وہ ایک گوشے میں کھڑی اس حیرت انگیز تماشے کو دیکھ رہی تھی کہ ایک ملائم آواز نے "اے پیارے" اسے پکارا۔ "میری رفیقہ" اس آواز نے گویا اسے مسحور ہی کر لیا۔ وہ اس کے ساتھ گفتگو کرنے لگی اور باتوں باتوں میں خدیجہ نے بتا دیا کہ وہ ایک غریب بیوہ ہے۔ "تم ہمارے ساتھ رہو۔ ہم تمھیں کھانے کو روٹی اور رہنے کے لیے جگہ دیں گے" اس کمیونسٹ عورت نے جواب دیا۔ خدیجہ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اور وہ اس کے ساتھ ہو لی۔ وہ اسے ایک عمدہ مکان کے اندر لے گئی جہاں خدیجہ کو ایک جدید قسم کے غسل خانے میں نہلایا گیا اور یورپی لباس پہنے کو دیا گیا۔ (۲۰۰ص)۔ دوسرے دن خدیجہ کو اسکول میں داخل کر دیا گیا جہاں اسے کمیونزم کی تعلیم ملنے لگی۔ خوش قسمتی سے اسے ایک ایسی استانی میسر آ گئی جو بڑی قابل اور ذہین تھی۔ اور یہ صرف اسی استانی کی بدولت تھا کہ تمام لڑکیاں لینن سے واقف ہوئیں۔ اور اس کی ذات سے محبت کرنے لگیں (۲۰۲ص)۔ اس اسکول میں ایک معلم فیض اللہ نامی تھا۔ وہ ابھی جوان تھا۔ وہ خدیجہ کے ہر کام میں دلچسپی لینے لگا یہاں تک کہ اسے اس سے محبت ہو گئی اور آخر کار دونوں نے شادی کر لی۔ خدیجہ اپنی پچھلی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہتی ہے کہ "ہم عورتوں میں ایک نئے ضبط نفس اور سیرت کی ضرورت ہے۔ بچپن ہی سے ہمیں سکھایا گیا ہے کہ ہم مردوں سے دور ہٹ کر رہیں اور اب جب ہم مردوں سے ملتی ہیں تو ایک عجیب سا قسم کی جھجک اور حجاب

باقی رہتا ہے۔" خدیجہ بیان کرتی ہے "تو میری زندگی میں یہ جھلک ایک بڑا المیہ (p. 225) کا باعث بنی۔ مردوں کے ساتھ ملنا میرے لیے ایک بڑا محترمتری پیدا کر دینے والا تجربہ تھا۔ اور کوئی تعریفی جملہ یا معانقہ تو میرے لیے ایک پہاڑ تھا۔"

یہ ہے اس لڑکی کی داستان جس کو جب اس کی عمر رسیدہ ماں نے اس حالت میں دیکھا تو وہ رو کر پکار اٹھی "تف خدیجہ تف۔ تو نے یہ کیا کیا، تو نے مجھے ہر مسلمان کی آنکھ میں ذلیل کر دیا ہے۔ کاش میں اس سے قبل مر چکی ہوتی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر تہذیب اپنا جال کسی خاص شخصیت یا تعلیم کے گرد بنتی ہے۔ یونان کی قدیم تہذیب فلسفیوں کی تعلیم کے گرد پھیلی جس تعلیم کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ یونانی آسمانی دیوتاؤں کی اولاد ہیں اور آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ وہ تہذیب جو آج کی دنیا اور قرون وسطیٰ کے مسلمان علماء کے لیے ایک مقدس صحیفہ بنی ہوئی تھی غلاموں کی ناتواں گردنوں کے اوپر استوار کی گئی تھی۔ یونانی گھریلو زندگی کی بنیاد طوائفوں کے اوپر چنی گئی تھی۔ اٹھارھویں صدی میں عقلیت کا جو طوفان اٹھا تو وہ اپنا بھنور والٹیر کے گرد بنا رہا تھا۔ وہی اس صدی کا پیغمبر تھا۔ اس طرح جب اشتراکیت پھیلی تو یہ قدرتی امر تھا کہ اس کے خداؤں کی شخصیتیں اجاگر ہوتیں اور لوگوں کے دلوں میں ان کے مندر تعمیر کیے جاتے وہ انسان جن کی زبانیں ہادیٔ برحق کی ثنا خوانی میں مصروف تھیں اب گا رہی تھیں:

"وہ آنے والے حسین ایام کے گیت گا رہے تھے۔

لیکن سب سے زیادہ گیت وہ جس ہستی کے متعلق بناتے تھے وہ لینن تھا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کے بغیر کوئی نیا گیت جنم لے ہی نہیں سکتا۔ لینن نے ہمارے زمزمہ خوانوں کو حق دے دیا کہ وہ جو چاہیں گائیں۔

اور وہ بیک زبان لینن کی حمد و ثنا کرنے لگے۔" (تاجک لوک گیت)

بقول مصنف لینن کی شخصیت ایک روایاتی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ان کے نزدیک لینن ایک فلسفی مفکر یا انقلابی لیڈر نہ تھا۔ ان کے نزدیک لینن ایک مقدس ناجی تھا، ایک ہادیٔ برحق اور علم و حکمت کا مہبط تھا۔ لینن کا نام اور اس کی شخصیت ان کے قلوب پر ہر وقت مسلط تھی۔ مصیبت کی ہر گھڑی میں لینن کی یاد ان کے لیے روح سکون کا پیام لاتی تھی (p. 300) اور وہ جو مذہب کے بیخ و بن سے اکھاڑنے آئے تھے خود ایک دیوتا انسان کے مندر نصب کر رہے تھے۔

"ایک ایشیائی گیت میں لینن چاند اور ایک ستارے کا زائیدہ بتایا جاتا ہے۔ اپنی روایتی قوتوں سے اس

انداد کو ہلاک کرتا ہے جو امن و راحت کی راہ کو روک بیٹھا ہے۔"

ایک اور روایت میں ہے:

"اور چھٹے سال میں جب زمین غلاموں اور نوابوں سے پاک ہو گئی تو لینن مر گیا۔ اور جب لوگوں نے دیکھا کہ لینن ان کے درمیان موجود نہیں تو انھوں نے کہا کہ وہ واقعی مر گیا ہے۔ لیکن لینن مرا نہیں تھا۔ وہ اپنے معلم خاطومیش کے صحیفے کو بھولا نہیں تھا۔ وہ پہاڑوں میں اپنی خوشی کو تلاش کر رہا ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ زمین لرز رہی ہے۔ نہیں، یہ زلزلہ نہیں۔ لینن پہاڑوں کو الٹ پلٹ کر اس چھڑی کو ڈھونڈ رہا ہے جس کی جنبش سے مسرت حاضر ہو جائے گی۔ اور جب وہ اس چھڑی کو پا لے گا تو کالے گورے زرد اور بھورے سب انسان مسرور ہو جائیں گے اور امن و سکون کی زندگی بسر کریں گے۔" (ص ۳۳۲)

انسان اپنے الفاظ میں اور اپنے گیتوں کی سانسوں میں اپنے قلب کی کیفیات عیاں کرتے ہیں۔ محض ایک زمانے کے ادب کو دیکھ کر اس زمانے کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خود دیکھیے عرب کا جاہلیت کا ادب انقلاب اسلام کے بعد کے ادب سے کتنا متضاد اور الگ تھا۔ لینن کی شخصیت ان کے قلوب میں رچ چکی تھی۔ بقول مصنف لینن کی ہستی اب ایک داخلی جذبہ بن چکی تھی۔ پھر بقول قرآن ایک پیٹ میں دو دل نہیں ہو سکتے۔ لینن کی محبت رکھتے ہوئے خدا اور رسول کی محبت کب رہ سکتی تھی۔ ایک مسلمان شاعر ایک مشہور نظم میں لکھتا ہے:

"آج ہماری تعطیل ہے

ہم اسے روزے کے نام سے پکارتے ہیں

اور ماضی بعید میں یہ کیسی عجیب تعطیل تھی!

گھر بار تج کے، کھیتوں سے دور

تمام دن مسجدوں میں گھٹنے جھکائے کھڑے رہتے تھے۔

اب کس کے پاس روزے کی بابت سوچنے کا وقت ہے؟

محکوم ماضی کی اس واہیات رسم کے لیے اب کس کے پاس وقت ہے؟

روزہ؟! (ص ۳۳۴)

دین کے ساتھ یہ تمسخر واستہزا ایک منطقی نتیجہ تھا اس ترقی کا جس کی طرف ترکستان کے مسلمان بڑھ رہے تھے۔ ایک مسلمان ادیب صدرالدین عینی اپنے بھائی کی وفات پر ایک نظم لکھتا ہے جس کے آخر میں وہ چلاتا ہے۔ "اے آسمانوں کے حاکم، تم ہی ہاں صرف تم ہی اس جرم کے مرتکب ہو" اور جب آسمانوں سے کوئی جواب نہیں ملتا تو وہ پکار اٹھتا ہے۔ "ہاں یہ خالی خولی آسمان گونگا ہے۔" (ص ۳۲۲)

عینی جدید خیالات کا علمبردار ہے۔ اپنی تحریروں میں جابجا وہ مذہب پر حملے کرتا ہے اور جوں جوں بالشوزم کی تحریک پھیلتی ہے اس کی بے باکی زیادہ تند ہوتی جاتی ہے۔ پہلے پہل وہ خدا کو مانتا تھا۔ پھر اس کے وجود ہی کا منکر ہوگیا۔ انقلاب کے اولین سالوں میں وہ خدا کو پکارتا ہے:

"اے خدا محلوں کی چھتیں توڑ ڈال

بدمعاش نوابوں کے تاج زمین پر اتار پھینک

اے خدا ہمیں ہولناک قید سے نجات دلا

اور رعشہ بر اندام نوابوں کو اپنے غلاموں کے سامنے سرنگوں کر دے۔

دو سال بعد جب اس کی دعا مستجاب ہوئی۔ زیردست زبردست ہوگئے اور محلوں کی چھتیں واقعی چرچراتی ہوئی نیچے آرہیں تو وہ کہنے لگا۔ "یہ اللہ کا کام نہیں۔ اللہ کو اس کاروبار سے کیا سروکار۔"

اپنی تازہ تحریروں میں عینی لکھتا ہے کہ یہ معجزہ اللہ اور اس کے رسولوں کا نہیں بلکہ مزدوروں کے زور بازو کا نتیجہ ہے۔ (ص ۳۰۸)

جو حضرات ادب پر ایک نگاہ رکھنے والے ہیں وہ خوب جان گئے ہوں گے کہ وسطی ایشیا کا یہ ذکر ہندوستان کی موجودہ حالت کو کس قدر بے نقاب کر رہا ہے۔

منفرد شوریک مشہور شاعر اپنی مشہور نظم "خطاب بہ رسول" میں کہتا ہے:

"تم کہتے تھے۔ تاج نہیں گریں گے

وہ گر گئے

تم کہتے تھے۔ تخت نہیں ہلیں گے

وہ ہل گئے

تم کہتے تھے۔ "قرآن کے الفاظ ابدی ہیں

ہماری عورتیں بے پردہ نہ ہوں گی"

وہ بے پردہ ہوگئیں

تم کہتے تھے۔ "مسجدیں کبھی خالی نہ ہوں گی۔

اسلام ہمیشہ حکمراں رہے گا۔"

بشکل: (۴۰ ص)

ایک شاعر منظوم مکالمے میں ایک فرد کی زبان سے کہلواتا ہے

"یہاں کسی ملّا امیر یا نواب کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

ہمیں کوئی خداوند نہیں چاہیے اور نہ اس کی گماشتے کی زمین کے کسی حصہ کی ضرورت ہے۔" (۴۰ص)

دیکھ لیا آپ نے وہ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ ان کی وحشی روحیں اب چلا رہی تھیں۔

"ملاؤ اب مت آؤ۔ تم ہماری پہاڑیوں کی بعید آواز سن رہے ہو؟ وہ کیا کہہ رہی ہیں؟ صدیوں ہم خدا اور اس کے رسول کی شریعت کی رہنمائی میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں لیکن کوئی تغیر نہیں، کوئی انقلاب نہیں دیکھو ہماری چوٹیاں کانپ رہی ہیں۔ ان کے یخ بستہ وزنی ٹکڑے تمہیں کچلنے کے لیے لڑھکتے آرہے ہیں۔ ہم ہم تم کو نہیں چاہتے۔ جاؤ، چلے جاؤ! ہم اپنے بھولے بھالے انسانوں کو تمہاری تعلیمات سے بچانا چاہتے ہیں۔"

—— یہ تھی صبح سمرقند!

اطلاع

دفتر شعبۂ استفسارات میں بعض ایسے خطوط آئے پڑے ہیں جن میں "تفہیم القرآن" کے کسی پہلو پر کوئی سوال یا مشورہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ خطوط صاحب تفہیم القرآن ہی سے متعلق ہیں اور موصوف کے صحت پاتے ہی ان کی خدمت میں پیش کر دئے جائیں گے۔ براہ کرم متعلقہ حضرات فوری جواب کا انتظار نہ فرمائیں!